نظرات

ابھی سپریم کورٹ کے فیصلہ (مسلم پرسنل لا) میں مداخلت کا ہنگامہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ اجودھیا کی بابری مسجد کو رام جنم بھومی مندر کے بطور ہندوؤں کے لیے کھول دینے کے عدالتی فیصلے، اور یوپی حکومت کے کمالِ مستعدی کے ساتھ اس فیصلہ پر عمل درآمد کے اقدام سے ایک اور روحانی صدمہ مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑا، جس کی ضرب بھی پرسنل لا کی مداخلت سے زیادہ مسلمانوں کے ذہنوں پر پڑی، اور جس کے ردِّ عمل میں مستقبل کا خوف بھی مسلمانوں کے دلوں میں پرسنل لا کے معاملے میں سپریم کورٹ کی مداخلت کے اقدام کے بمقابلہ زیادہ محسوس ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ بابری مسجد کے معاملے میں مسلمانوں کو پہنچنے والے صدمہ کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے، نہ ان کی اس بیقراری کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے، جو اس واقعہ کی خبر سے کشمیر سے لے کر راس کماری اور آسام سے لے کر گجرات اور مہاراشٹر تک کے وسیع و عریض علاقے میں آباد مسلمانوں کے دلوں میں اس وقت پائی جا رہی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی فکر و تشویش کا خاص سبب یہ ہے کہ وہ گذشتہ چند برسوں خاص طور پر ۱۹۸۰ء کے الیکشن کے بعد سے ایک نئی اور ہمہ گیر فرقہ وارانہ جارحیت کی زد میں ہیں اور ایک کے بعد ایک ایسے صدموں سے دوچار ہو رہے ہیں، جن کی کوئی مثال ۱۹۴۷ء کے تقسیم ملک کے حالات کے سوا ۳۸ برس کی سیاسی تاریخ میں نہیں ملتی۔

سب سے پہلے تو انھیں، تامل ناڈو میں چند ہریجن خاندانوں کے مسلمان ہو جانے کے واقعہ پر ایک بڑی ذہنی آزمائش سے اس وقت گذرنا پڑا جبکہ ان پر ہر چہار طرف سے یہ الزام عاید کیا گیا

ہندوؤں میں تبدیل مذہب کی ایک خفیہ اور منظم تحریک ان کی طرف سے چلائی جارہی ہے اور عرب ملکوں سے آنے والی نامحدود مالی امداد، اس منظم تحریک کی پشت پر ہے۔ مسلمانوں کے لیے بڑی افسوس ناک اور صدمہ انگیز بات یہ تھی کہ اس تحریک کو مرکزی حکومت کی خاموش حمایت بھی حاصل تھی جس سے شہ پاکر پورے ملک میں مسلمانوں کے مقابلہ کی ایک ایسی فضا پیدا ہوگئی جس میں ہندوستان کے چپہ چپہ پر ان کے خلاف محاذ آرائی کے مناظر دکھائی دینے لگے، وشو ہندو پریشد نام کی ایک نئی اور بظاہر غیر سیاسی جماعت کی تشکیل ہوئی جس کا مقصد ہندوؤں میں بیداری اور تحفظ کے احساس کو فروغ دینا بتایا گیا۔ لیکن اس کی طرف سے منعقد کیے جانے والے اجتماعات، ریلیوں اور رتھوں کے جلوسوں کا سارا نشانہ مسلمان تھے۔ ہندو وشو پریشد کے زیر اہتمام ان ریلیوں، جلوسوں اور رتھ یاتراؤں کے درمیان نہ صرف بڑے شہروں بلکہ قصبات اور دیہات تک میں بڑے بڑے اجتماع منعقد کیے گئے، اور ان اجتماعات میں تبدیلیٔ مذہب کے واقعات کو بے بنیاد اور مبالغہ آمیز و اشتعال انگیز طریقہ سے بیان کرکے ہندوؤں کو ایسے دشمنوں سے خبردار، ہوشیار اور چوکنا رہنے کی تلقین کی گئی، جو ہمیشہ سے ہی ان کے اور ان کے دھرم کے جانی دشمن رہے ہیں، اور ان کی اکثریت کو ختم کرکے، اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو بحال کرنے کی خوفناک سازش میں لگے ہوئے ہیں۔

ان اجتماعات اور یاتراؤں کے علاوہ بڑے شہروں اور قصبوں میں جن جاگرن سبھاؤں کا ایسا سلسلہ شروع کیا گیا، جو رات رات بھر جاری رہتا، اس ملک گیر اہتمام اور انتظام کی بدولت ہندوستان میں فرقہ واریت کے فروغ، اور ایک مخصوص فرقے کے خلاف منافرت کا ایسا ماحول تیار ہوگیا کہ شہروں کے علاوہ دیہات تک بھی، جہاں تک فرقہ واریت کی لعنت اور جارحانہ انداز کی منافرت سے پاک سمجھے جاتے تھے، مسلمانوں کے خلاف نفرت کے اس پرچار کی زد میں آگئے۔

اس کے بعد وشو ہندو پریشد کے بطن سے ایک نئی تنظیم رام جنم بھومی مکتی تحریک پیدا ہوئی جس نے ۱۹۸۴ء کے جون کے مہینے میں اجودھیا کی بابری مسجد کو رام جنم بھومی مندر کے بعور آزاد

کرانے کی تحریک اٹھائی اور اس مقصد کے لیے اجودھیا سے دہلی تک مارچ کا ایک پروگرام بنایا۔ اس کے علاوہ رام جنم بھومی مکتی رتھوں نے ایسے جلوسوں کی طرح ڈالی جو بیک وقت اتر پردیش کے مختلف علاقوں میں متحرک دکھائی دینے لگے، اور ان کے ذریعہ مسلم بادشاہوں اور مسلم عہد حکومت اور خود مسلمانوں کے خلاف ایسا زہریلا پروپیگنڈہ کیا گیا کہ پورے ملک، خصوصاً اتر پردیش کا پورا سیاسی اور سماجی ماحول فرقہ واریت کے زہر سے نیلا ہوگیا۔

فرقہ واریت کے فروغ، اور مسلمانوں کے خلاف منافرت کی یہ منصوبہ بند پورے زور شور کے ساتھ جاری تھی کہ ۳۱ اکتوبر کو وزیر اعظم اندرا گاندھی کے قتل کا واقعہ پیش آگیا، اور اس کے نتیجہ میں سکھوں کے خلاف خونریز فسادات، شمالی ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھوٹ پڑے جن کی وجہ سے یہ تحریک وقتی طور پر معطل کردی گئی۔ ۱۹۸۵ء میں سپریم کورٹ کا شاہ بانو کیس میں وہ فیصلہ سامنے آیا جس کے خلاف ۱۹۶۶ء کے بعد مسلمانوں میں عدیم النظیر اتحاد کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کرکے اپنے صدمہ اور ناگواری کا اظہار کیا، اور اس کی وجہ سے پورے ملک کے مسلمانوں میں اضطراب، تشویش اور بدگمانی کے جذبات عام ہونے کے علاوہ خود اعتمادی اور مقابلہ کا وہ احساس بھی پیدا ہوا، جسے آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ایک بالکل نئی کروٹ کے نام سے موسوم کیا جاسکتا تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے زبردست عوامی جلسوں، حاضری کی تعداد کے لحاظ سے بے مثال اجتماعات، اور احتجاج و ناگواری کے بے نظیر مظاہروں کے اثرات و نتائج جہاں اس صورت میں ظاہر ہوئے کہ حکومت اقلیتوں کی بے اطمینانی اور بے قراری کا احساس کرکے، انھیں مطمئن کرنے کی صورتوں پر غور کرنے پر مجبور ہوئی، وہیں، فرقہ پرست عناصر مسلمانوں کا یہ نیا جوش و خروش دیکھ کر پریشان ہوا اٹھے اور انھیں اپنی اس مہم کے ناکام اور غیر مؤثر ہونے کا خطرہ صاف دکھائی دینے لگا جو پانچ برسوں سے بھی زیادہ مدت سے مسلمانوں کو خوف زدہ کرنے کے مقاصد سے چلائی جارہی تھی۔ اس پریشانی میں اور زیادہ شدت اس وقت پیدا ہوئی جب کہ وزیر اعظم راجیو گاندھی نے مسلم رہنماؤں اور علماء کے

ایک نمائندہ وفد سے اس بات کا وعدہ کیا کہ وہ مسلم مطلقہ عورتوں کے لیے ایک ایسا قانون پارلیمنٹ سے منظور کرادیں گے جو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کے اندیشہ کو ختم کردے گا۔

اس پریشانی اور مسلمانوں کی کامیابی کے تصور سے پیچ وتاب ہی وہ اصل سبب ہے، جس نے ہندوستان بھر کے سیاسی، صحافتی، اور اکثریتی حلقوں میں نہ صرف مجوزہ قانونِ طلاق کے خلاف مخالفت، عزاحمت اور نکتہ چینی کا ایک طوفان کھڑا کردیا بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر بابری مسجد کے واقعہ کی صورت میں ایک ایسے قضیہ کو پوری شدت کے ساتھ اُٹھا دیا جس سے مسلمانوں کا تڑپ اٹھنا، اور مذہبی جذبات کو لگنے والے زخموں سے بے حال ہوجانا ایک لازمی اور فطری امر تھا۔

یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندوستان سے زیادہ مذہب پرست اور مذہبی معاملات میں نازک احساس کے حامل لوگ دنیا کے کسی ملک میں نہیں پائے جاتے، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی جدید، اور پارلیمانی سیاست میں مذہب کے استعمال کی گنجائش گرہی، اور جماعتی مفادات کے لیے اس حد تک موجود ہے کہ ہندوستان کے سیاستداں، اپنی کامیابی اور سیاسی اغراض کے لیے، گذشتہ ۵۰ برسوں سے کر رہے ہیں، ہندوستان کے عوام اس بات سے واقف ہونے کے باوجود کہ مذہبی اشتعال کے ذریعے، ان کا استحصال سیاسی مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے، اپنی شدید مذہبی وابستگیوں کے سبب، بار بار اس کے جال میں آجانے سے اپنے آپ کو نہیں روک پاتے۔

بابری مسجد کے سلسلے میں بھی اصل مقصد، جسے فی الحال اکثریت سے متعلق فرقہ پرستوں نے پوری طرح حاصل کرلیا ہے، مسلمانوں کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرکے، لاچاری اور بے بسی کے ایسے احساس میں گرفتار کرنا ہے، جس کی وجہ سے وہ عزت نفس سے محروم ہوجائیں اور سیاست اور قومی معاملات ومسائل میں اکثریت کی خواہش اور مرضی کو فیصلہ کن سمجھنے پر مجبور ہوجائیں، اس لیے یہاں اس بات کو سمجھانے اور معقولیت کے ساتھ افہام وتفہیم کے ذریعہ اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش

کی کوئی وجہ موجود نہیں، نہ تاریخی حوالوں سے اخذ کردہ یہ دلائل کوئی معنی رکھتے ہیں کہ بابری مسجد کبھی مندر نہیں تھی، نہ تو بابر نے کسی مندر کو ڈھایا اور نہ ہی اس کی جگہ موجودہ مسجد کو بنایا تھا اور یہ کہ بابر کبھی اجودھیا نہیں آیا۔ اور یہ کہ اس مسجد کے بارے میں رام جنم بھومی مندر کی کہانیاں بالکل بے بنیاد ہیں۔

اصل اور بنیادی بات یہ ہے کہ بابری مسجد کا قضیہ، اور اسے ایک مندر کی حیثیت سے، ہندو دیا تریوں پر کھول دینے کا فیصلہ، گذشتہ ۳۷ برسوں کی آزادی کی تاریخ کا ایک ایسا المناک باب ہے، جس کی کوئی مثال اس سے پہلے موجود نہیں۔ اور اس کا بدترین اور تاریک پہلو یہ ہے کہ اس اقدام میں ریاستی حکومت برابر کی شریک بلکہ شریک غالب کی حیثیت رکھتی ہے کیوں کہ اسی نے ایک غیر متعلق عدالت کے حکم پر اس مسجد کو مندر کی شکل میں ہندوؤں کے حوالے کیا اور ہائی کورٹ میں زیر سماعت مقدمہ کے فیصلے اور عدلیہ کے احترام کی کوئی پروا کیے بغیر، ایک ایسی آزمائشی صورت سے یہاں کے ہندوؤں نے مسلمانوں کو دوچار کر دیا، جو نہ صرف فرقہ وارانہ منافرت اور مذہبی کشمکش کے طویل سلسلہ کے امکان سے بھری ہوئی ہے بلکہ اس میں خود حکومت کے بھی کسی ایک فریق کی حمایت سے مکمل محرومی کا ناگزیر خطرہ نمایاں طور پر موجود ہے۔

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ بابری مسجد کا قضیہ اس کشمکش اور مسلمانوں کے خلاف اس ہم کا نقطۂ عروج ہے جو آزادی کے فوراً بعد شروع کر دی گئی تھی۔ اسی کے ساتھ اس بات کی کوئی علامت موجود نہیں کہ مسلمان اس صورت حال کو برداشت کر لیں گے، اور اس بات کی اجازت دینے پر تیار ہو جائیں گے کہ بابری مسجد کو مندر کے طور پر اکثریت کا حق تسلیم کر لیا جائے، زیادہ سے زیادہ سنجیدہ اور کم از کم غیر جذباتی انداز میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اتر پردیش کی حکومت نے مسلمانوں پر ایک طویل جدوجہد کی آزمائش مسلط کر دی ہے، اور ہم نہیں جانتے کہ اس کا انجام کس صورت میں نکلے گا۔ اور یہ سلسلہ کہاں جا کر ختم ہوگا شیکسپیئر کے الفاظ میں فی الحال اس سے زیادہ کہنا مناسب بھی نہیں کہ "اے بدی تجھے راہ مل گئی۔"